ابجد
حرف اکادمی
بے لکھی نظمیں

روش ندیم

ٹشو پیپر پہ لکھی نظمیں

حرف اکادمی

راولپنڈی

شاعر کی دیگر تصانیف

پاکستان، برطانوی غلامی سے امریکی غلامی تک (تاریخ)

تیسری دنیا کا فلسفہء انکار (سیاسی وسماجی تنقید)

ادبی تحریکوں کا زوال (ادبی تنقید)

ابر کی آہٹ (ناول)

منٹو کی عورتیں (تحقیق وتنقید) زیر طبع

پتہ برائے رابطہ

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، اصغر مال، راولپنڈی

فون: 0300-9505159

پبلشر؛ حرف اکادمی

103/A-1 ریڈیو پاکستان سٹاپ

پشاور روڈ، راولپنڈی۔ فون 5566131

پرنٹر؛ آریانہ پرنٹرز

العابد مارکیٹ، سرکلر روڈ، راولپنڈی

اشاعت اول؛ جنوری 2001ء

تعداد؛ 500 قیمت: -/75

سرورق ایم سلیم پاشا

منیلا کے نام

ڈاکٹر نوازش علی: روش ندیم اپنی نظموں میں فلسفیانہ مسائل پر غور وفکر کرتا دکھائی دیتا ہے اس نے ایسے موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں جو بڑے ادیبوں کے ہاں نظر آتے ہیں ان میں وقت کا اچھوتا تصور پیش کیا گیا ہے یہاں نہ صرف وقت کے مسئلے کو سمجھنے کی کوشش یا وقت کے اثرات کا ذکر ہے بلکہ جدید زندگی کے تصنع سے گھبرا کر فطرت کی طرف رجوع اور ماضی وحال کا تقابل بھی ہے

داؤد رضوان: ان کی نظموں میں سوچتا ہوا ذہن نظر آتا ہے اور معاشرتی بگاڑ کی صورتحال پیش کی ہے۔ان کے ہاں آئیڈیالوجی کے مسئلے پر غیر جانبداری کی بجائے نظریاتی وابستگی کے حوالے سے شاعری ملتی ہے۔

امجد طفیل: ان کی نظموں میں مجموعی طور پر ارتقاء کا تصور ملتا ہے تصور اور حقیقت کا تصادم نمایاں ہے مگر نارسائی کے باوجود آس موجود ہے یہ نظمیں وضاحتی نوعیت کی ہیں جن میں مکمل ایمائیت ہے

سعید احمد: اس شاعری میں ایک جدید ذہن کی نئے امیجز لانے کی کوشش کے علاوہ عصری شعور، انسانی بے بسی، خواہش رفعت اور حقیقت پسندی واضح ہے انھوں نے سنجیدہ موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں

ڈاکٹر یونس شیخ: یہ نظمیں فلسفیانہ شعور سے بھرپور دانشوری کا شاعرانہ اظہار ہیں شاید ان نظموں کے موضوعات کسی پابند نظمیت میں مقید نہ ہو سکتے تھے اس لحاظ سے ان نظموں کا اسلوب فکر کے تابع لگتا ہے ان میں نئی لفاظی، نئے تراکیب و تلازمات اور نئے تصورات ملتے ہیں تمام نظموں میں نظمیت ،الفاظ اور سوچ کی سطح پر شاعرانہ بہاؤ ہے اور شعور وادراک معنی کی کئی تہوں مین جلوہ گر ہیں ان میں ایک خصوصی موسم ہے جو شعوری رو کی شکل میں تمام نظموں میں دوڑتا ہے ان کی بڑی خصوصیت ان کی سنجیدگی ہے

آفتاب اقبال شمیم: روش ندیم کی نظموں میں ایک سوچتا ہوا ذہن دکھائی دیتا ہے انھوں نے ہمیشہ کے جبر کو آج کے جبر سے ملانے کی کوشش کی ہے نظموں کی زیریں فکر میں ایک تسلسل موجود ہے امیجری اور تشبیہات واستعارات کی تازگی کے ساتھ ایک ردھم موجود ہے اور یہ خارجی ردھم ریاضت کیساتھ داخلی ردھم بن سکتا ہے

(اقتباس از رپورٹ حلقہ ارباب ذوق، راولپنڈی)

روزنامہ جنگ 18-2-01 ہفت روزہ گلستان 2-4-01

نظمیں

ادھ پکی خوبانیاں

خموشی الفتوں کے سوکھتے پانی کا مدھم سا اشارہ تھا
جو مجھ پر منکشف ہونے نہ پایا تھا
وہ وعدے اور قسمیں بھی تھیں املتاس کی پھلیاں
جو خود ہی ٹوٹ کر شاخوں سے گرتی ہیں
تعلق گھر سے باہر سیڑھیوں پہ رک گیا تھا
پھر ہمارے درمیاں وہ کس طرح رہتا؟
خدایا! پچھلی رت کی جامنوں کے رنگ پوروں سے اترتے کیوں نہیں آخر؟
مجھے ان بھیگتی راتوں میں کس کی یاد کی آہٹ ستاتی ہے

کہ جس کا رنگ میری سوچ کی گھاٹی کے اندر کھو چکا کب سے

محبت ڈوبتے دن کی ادھوری سی کہانی تھی

تو پھر یہ کون ہے

جو ادھ پکی خوبانیوں کا ذائقہ لے کر مرے خوابوں میں آتا ہے

یہ کس کے ہاتھ نے نیندوں کے رخساروں کو چوما ہے؟

یہ کس موسم کی سرسوں مسکرائی ہے؟

.... میں اس سے ملتجی ہوتا ہوں کہ اس منتظر سورج کو

ہنس کے دیکھ لو تا کہ وہ ڈھل جائے

وہ ہنستی ہے

شرارت سے ہوا کو چومتی ہے

گنگناتی ہے

میں کہتا ہوں

ترے گالوں کے ڈھلوانوں پہ

چپ سادھے پڑے ڈمپل

مجھے کیوں خشک سی جھیلوں سے لگتے ہیں

وہ رو دیتی ہے
اور جھیلیں کسی بے رت کے ساون سے
چھلک جانے کو کرتی ہیں.......

مرے خوابوں کا برتن ٹوٹ جاتا ہے چھنا کے سے
سو میں نے تم سے دوری کا یہ زینہ کیا اترنا تھا
کہ میں جیون کے اس پاتال کے اندر ہی جا اترا
پھر اس کے بعد کیا تھا
بس وہی اک ریستوراں کی میز
چائے اور وہی بوسیدہ باتوں کی تھکن کا دکھ
وہی سڑکیں ، وہی موسم ، وہی شہروں کی یکسانی
وہی جنموں کی ویرانی

ادھورے خواب کا نوحہ

انا میکا!

کہانی گھومتی پھرتی اسی نقطے پر آئے گی

جہاں پر بے یقینی کے گھنے جنگل

وساوس اوڑھ کر چپ چاپ بیٹھے ہیں

ادھورے عہد میں ایمان کی تکمیل کیا ہوتی؟

یہاں تو خود خداوند نامکمل ہیں

تو پھر کیسے میں اپنی ذات کی تیرہ حدوں سے بھاگ سکتا تھا؟

مری سوچوں کی لوحوں پر

میری ماں نے وہی لندہ لیا تھا

جو اسے اجداد نے اپنی وراثت میں تھمایا تھا

انا میکا!

تمہارے واسطے میں کوئی خوشخبری نہیں لایا

جھلستی راہگزاروں سے میں کیسے پھول لے آتا؟

اندھیروں کے جہنم سے میں کیسے روشنی لاتا؟

ابھی برفیں نہیں پگھلیں

نہ ساحل پر پڑے دریاؤں کی نیندیں ہی ٹوٹی ہیں

مگر پھر بھی

مرے اس آرزوؤں کے ہرے آنگن میں چڑیاں چہچہاتی ہیں

(وہ تم لے لو)

میں اپنی ناک پر خوش فہمیوں کی کوئی عینک رکھ نہیں سکتا

مگر کم تو نہیں، پھر بھی تمہارے ساتھ ہنستا ہوں

تمہارے قہقہوں کی بارشوں میں بھیگ جاتا ہوں

کہ شاید اک نہ اک دن میں بھی اس شہر سبا کا بھید پالوں

جس کے بارے میں

مرے اجداد دن بھر کی مشقت کاٹ کر مجھ سے یہ کہتے تھے

''سنو اک روز ایسا آئے گا

جب تم بہاروں کے نگر میں پھول بن کر مسکراؤ گے''

پہ کتنی ان گنت صدیاں سلوموشن کے پنگوڑے میں بیٹھی ہیں

اور اب تو میرے بالوں میں بھی چاندی کا بسیرا ہے

نگاہیں آج بھی ان آرزوؤں کے کھنڈر میں گشت کرتی ہیں

ایک خط ـــــــ پرندوں کے نام

بدھا جس پیڑ کے نیچے کبھی نروان کو آواز دیتا تھا

سنا ہے شہر والوں نے اسے بھی کاٹ ڈالا ہے

(ستاروں کے کسی جھرمٹ میں بیٹھی ایک حسرت رو پڑی ہو گی)

پرندو! در گزر کرنا

کہ جب سے شہر کے لوگوں نے

اپنے سائبانوں کے لئے خود چھتریاں ایجاد کر لی ہیں

وہ کہتے ہیں

"ہمیں پیڑوں کی چھاؤں

یا تمہارے گھونسلوں سے کیا؟
ہمیں تو جون کے سورج بھی اب کچھ کہہ نہیں سکتے
ہم اک کمزوری سی شے سے
ذرا سی آکسیجن مانگنا ذلت سمجھتے ہیں"

(سنو یارو!
ابھی کل تک
یہی انساں ہرے پیڑوں کی شاخوں پر
اچھلتا کودتا جیون بتاتا تھا
مگر جب اس نے اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہونے کا فن سیکھا
تو اپنے ہاتھوں میں کلہاڑیاں لے لیں
سنا ہے
اب وہ اپنے معبدوں کو کاٹ کر بندوق کے دستے بناتا ہے)
پرندو! درگزر کرنا
تم اہل دل ہو
پیڑوں سے ابھی تک پیار کی رسمیں نبھاتے ہو

پناہ گاہ

تم میرا سہارا ہو!

دوسرا کنارا ہو!

سابقہ رفاقت کی، گمشدہ مسافت کی

دھوپ دھوپ راہوں کا سایہ دار پیپل ہو

کربِ نارسائی کے

اک سیہ سمندر میں تیرتا جزیرہ ہو

جس میں سرخ ہونٹوں کی بارشیں برستی ہیں

یہ لُٹے سپاہی کی آخری پناہ گاہیں

آخری مچانیں ہیں

پہلی نارسائی کے دکھ بھرے نتیجے میں

جسم کی رفاقت سے خواہشیں بچانے کے

زندگی نبھانے کے

بس یونہی بہانے ہیں

دل نگر پہنچنے کو

آنکھ کے علاوہ بھی بے شمار رستے ہیں

دوسری محبت میں راستے بدلتے ہیں

تم کو کیا خبر جاناں؟

تم سے کیا کہیں جاناں؟

تم تو برف موسم میں آگ کا الاؤ ہو!

درد کی تھکانوں میں روح کا پڑاؤ ہو!

دوسری محبت ہو!!

کنوارے شہر کی لڑکیاں

یہاں شہزادیاں
جب خواب عمروں کے دروں کو کھولنے آئیں
تو ان کے پاؤں میں تکلے چبھے
اور عمر گزری گیسوؤں میں برف کے موسم اتر آئے
مگر اب تک خیالوں کے وہ شہزادے نہیں آئے
محل سارے کا سارا نیند میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے
لبوں کی آہٹیں
یا آنکھ میں لکھی ہوئی کچھ سسکیاں کیسے پڑھے کوئی؟

دروں پر دور سے آتے ہوؤں کے واسطے کچھ پھول رکھے ہیں
بنیروں پر کسی کی یاد کی چڑیاں چہکتی ہیں
مگر اے چاند کی بڑھیا!
وہ جن کو بانجھ سوچیں چاندراتوں میں ڈراتی ہیں
وہ تنہا لڑکیاں اپنے سوالوں میں کھڑی آواز دیتی ہیں
''سحر تو روز ڈھلتی ہے
ابھرتی ہے
مزاج وقت کیوں اب تک نہیں بدلا؟
ہماری منزلیں کس کے تعاقب میں گئیں
لوٹی نہیں اب تک؟
یہ سب کس کی شرارت ہے؟
ٹشو پیپر پہ تقدیریں لکھیں
اور پانیوں کی گود میں رکھ دیں''
سوکتنی لڑکیاں تنہائیوں کے دشت کی باسی
کہ جن کے ہونٹ کی نیلاہٹوں پر رقص کرتی آرزوئیں ہیں
اب ان کے سرخ رنگے رہنوں سے

ذات کی محرومیاں تو چھپ نہیں سکتیں

حصارِ خواب سے وہ لڑکیاں باہر نہیں آتیں

جو کچی گاگریں بھرنے گئیں

.....................!

....................!!

..................................؟

کہانی نامکمل ہے!

چنابوں کے دہانوں پر بگولے راج کرتے ہیں

دوپہریں آسمانوں کے اثر میں ہیں

سلگتے آنگنوں میں دھوپ سے مصلوب ہوتی لڑکیاں

سورج سے کہتی ہیں

"ہمیں چھتری کوئی بھیجو

ہمیں اپنے پیا کے دیس جانا ہے"

آکاس بیل

میں اکثر سوچتا رہتا.................!

یہ دنیا کیسی دنیا ہے

جہاں لوگوں کو دفتر کے جھمیلوں سے فراغت ہی نہیں ملتی

سویرے چائے میں اخبار کے کالم بھگو کر ناشتہ کرنا

پھر اس کے بعد دن بھر فائلوں پر بیٹھ کر

دریائے فردا کے نئے گمنام ساحل ڈھونڈتے رہنا

اور آخر ڈوبتے سورج کی کرنوں پر گئے دن کی

خباثت تھوک کر گھر لوٹنا اور سوچنا'' ....ہم کون ہیں؟''

آخری پہر کی ڈاک

(چار ایکٹ کی نظم)

پہلا ایکٹ

رات سمے کی ڈاک سے آیا سہما سا کاغذ کا سپنا

جس کی بالکنی سے کل تک اک لڑکی کے قدموں کی سی

چاپ سنائی دیتی تھی

دوسرا ایکٹ

آج سویرے آنکھ کھلی تو اک ننھی سی زخمی سوچ

بندھی تھی جس کے پیر میں ڈور

دل کی آنکھ منڈیر پہ بیٹھی بیتا موسم یاد دلائے

تیسرا ایکٹ

ڈھلتی شام نے سرگوشی کی

''دیکھنا وہ بھی چپ سی بیٹھی دل کے زخم کھرچتی ہوگی

آنکھیں موندھے اوندھی لیٹی آس کے موزے بنتی ہوگی''

چوتھا ایکٹ

مستقبل کا بوڑھا بابا آنکھیں میچے ہاتھ پسارے

دھیرے دھیرے ہنستا ہوگا

وقت کے ایک ٹشو پیپر پر درد کا نغمہ لکھتا ہوگا

مٹھی سے پھسلتی نروان کی ریت

(گوتم بدھ کی مورتی دیکھ کر)

سدھارتھ!

آج تو صدیوں کی حیرانی لئے ان پتھروں کی قید سہتا ہے
پڑی ہے دھول جن پر ان گنت عہدوں کے رستوں کی
عیاں ہیں کس قدر گہری دراڑیں جن پہ وقتوں کی
تو آنکھیں بند کر کے آج بھی
عرفان کے انجان لمحے کے فسوں میں ہے
(یہ تیرے شانت چہرے پر تبسم کھلتا جاتا ہے)

وہی لمحہ

کہ جس کی جستجو میں تو گھنے جنگل کے اندر گم رہا برسوں

مگر پایا تو کیا پایا؟

فقط نروان کی ایک خشک سی ٹہنی!

جسے تو یہ سمجھ بیٹھا

کہ یہ ہے قصر مایا کی کوئی نایاب سی کنجی

(بڑھاپا، موت، بیماری کا دکھ تجھ پر ابھی تک کھلکھلاتا ہے

جسے تو چھوڑ کر بستی سے بھاگا تھا)

سدھارتھ!

اپنی آنکھیں کھول.......................!

اپنے من کے کاغذ پر لکھی دنیا سے باہر آ

جہاں پت جھڑ کا موسم ہے

جہاں پر برف گرتی ہے

وہ برگد جس کی چھایا میں تو اپنے خواب بنتا تھا

وہی جنگل

کہ جس میں شانتی کے پھول کھلتے تھے

وہ سب کچھ کٹ چکا ہے

اب وہاں اک شہر پھیلا ہے

ترے نروان کے لمحے سے جس کا فاصلہ ہے تیس صدیوں کا

کپل وستو کے شہزادے!!

تو بھوکا ہے

ترے کمزور سے تن پر کوئی کپڑا نہیں ہے

اور باہر ٹھنڈ ہے

اور ہاتھ میں سکہ نہیں کوئی

چل اٹھ!

تجھ کو کسی مل میں کہیں نوکر کرا آؤں

کنارے دھوپ کے

دھیان کی آخری حد پر بہتا
یادوں کی اک اجرک اوڑھے گئے جہانوں کا اک دریا
سانسوں کے سنسان سفر میں ڈوبتے دن کی کھڑکی کھولے
گیت پرانا ڈھونڈ رہا ہے
پوروں کے گرداب میں الجھا چاند کا رستہ ڈھونڈ رہا ہے

لمحہ لمحہ زینہ اترے ڈھلتی شام کی آخری ہچکی
آنکھوں کی دہلیز پہ چمکے سرد خزاؤں کی ویرانی

خوابوں کی دھندلی بستی سے جھانک رہی ہیں صدیاں کالی

ایک ٹشو پیپر کی کشتی

سات سمندر بہتا پانی

آس کی سوئی دوپہروں میں سایہ سایہ چھپتا منظر

ندیا ندیا بہتے چہرے

بستی بستی اڑتا بادل

سپنا سپنا گھومتی ناری ٹھیکریوں پر وعدے لکھے

دریا ایک تمنا جیسے

پانی ایک کہانی جیسے

وقت کی ڈھلوانوں سے گرتا کچی مٹی کے برتن میں

کس آکاش کا تارا اترا

رات کی چوڑی کرچی کرچی

صبح کا چہرہ اترا اترا

ریتلے چہرے سرد ہوائیں

کاغذی ہونٹ اور زرد صدائیں

سورج کی محراب سے آگے

دلدل کے اسرار سے آگے

نیالے موسم کا جادو

ہاں اور ناں کا شام سویرا

دشت گماں کا گھور اندھیرا

باب ازل کا پہلا ورق

(1)

سو جب سورجوں کی کشش نے اندھیرے خلا میں ستاروں کو بکھرا دیا
تو یہ ننھا سا عالم کسی دلنشیں دائمی راگنی پر مچلنے لگا
اور گھڑیوں کی ٹک ٹک پہ چلنے لگا تھا

اسی دن سے میں

ارتقاء کے حسیں مرتباں میں پڑا اپنی تخلیق کے سال
گننے لگا تھا

.......................!

...........................؟؟

وہ سات آسمانوں کے آخری منزل پہ بیٹھا خداوند عالم
کسی سوچ میں غرق تھا
اور فرشتے ازل کے کیلنڈر پہ نظریں جمائے پریشان تھے
اک جواں حور ویران فردوس میں
دودھ کی اک ندی پاس بے چین بیٹھی ہوئی تھی

(2)

جانے کتنے برس؟
کتنے نوری برس؟
جھومتے جھومتے یونہی رخصت ہوئے
میں درختوں کی شاخوں پہ جیون بتاتا ہوا ایک دن آدمی بن گیا
جانے کیا ہو گیا؟
عرش کی گھنٹیاں بج اٹھیں
اس خداوند عالم کی نیندیں اڑیں
اور ہراساں فرشتوں کے چہروں سے ان کی جبینیں اڑیں
اور مرے پاؤں کے ناخنوں تک جو آئیں
امر ہو گئیں

محبوبہ کی قبر پر

تری سانسیں حسیں موسم کو تھامے دور کی راہوں پہ جا نکلیں

مگر پھر بھی مری آنکھوں کے ساحل پر یہ لکھا ہے

کہ تو اک دن ہمیشہ کی طرح ہنستی مہکتی

شام کی پازیب چھنکاتی مرے گھر لوٹ آئے گی

مگر اس خواب کی کچی کلی جب بھی مہکنے کو ذرا تڑپی

تو سرکش آندھیاں چل دیں

سو اب تو ہی بتا مجھ کو

میں ہاتھوں کی لکیروں کے سفر پر جاؤں تو کیسے؟

میں ٹھہرا عکس کا قیدی

جو سوچوں کے سیہ پردے پہ تصویریں بناتا ہے

مجھے شہروں کے جنگل سے کہاں نروان ملنا تھا

یہ تیرے خواب کے اندھے بیاباں آج میرا گیان ٹھہرے ہیں

میں کاندھوں پر ازل سے آسماں رکھے

زمانوں کی تہوں میں گم

اسی پل کے دوراہے پر کھڑا آواز دیتا ہوں

کہ جس لمحے تری سانسیں

حسیں موسم کو تھامے دور کی راہوں پہ جا نکلیں

دلوں کے گنبدوں میں کوئی بھی نغمہ نہیں گونجا

نہ اندھی رات کے در پر کسی کی دستکیں گونجیں

میں خود پہ منکشف ہونے کو ہوں آخر

کہ میں اپنے تعاقب میں

تری یادوں کے دھندلے راستوں کا اک مسافر ہوں

سنہرے سورجوں کی ایک چنگاری کا طالب ہوں

حرامجادی

اری او تاجی!

حرامجادی!!

سیاہ رنگت کی حور میری!!

تمہارا سینہ ہے معبدوں کے عظیم گنبد کی طرح ارفع

تمہارا چہرہ.....................

مگر نہیں وہ تمہارے کولہے

کہ جن کو فرصت کے دیوتا نے بڑی محبت سے ڈھالا ہوگا

جو تم ہنسو تو یہ زردی مائل تمہاری مسکان میرے سپنے گلاب کر دے

تمہارے میلے بدن کی خوشبو ہے میری تنہائیوں کی ساتھی

او میری رانی!

حویلیوں کی نجاستوں سے پلید لڑکی!

تمہارے تن کا نمک تو بس اک اضافی جز ہے

زمینداروں کی خواہشوں کا

جوان کتیائیں جن کے ڈر سے

ہماری گلیوں میں دبکی بیٹھی لرز رہی ہیں

تمہارے سینے پر اک چٹکی

تمہارے کولہے پر اک تھپڑ

اور اک غلاظت بھرا تبسم

اور اک گالی ''حرامجادی!''

میں جانتا ہوں یہ سب حقیقت

نجانے پھر کس لئے میں چپ ہوں

حسین تاجی!

سیاہ رنگت کی حور میری!!

تاریخ شرارت کرتی ہے

سنا ہے بکراں تاریخ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کی کوئی عادت نہیں رکھتی
مگر یہ وقت جس کی گود میں لیٹے ہوئے
وہ منہ بسورے جا بجا کروٹ بدلتی ہے
اسے خودسر سمجھتا ہے
یہ اس کی لاابالی سی طبیعت کو وہ بوڑھا ہی سمجھتا تھا
جواب دیوار پر میخوں کی اک سولی پہ لٹکا
منجمد آنکھوں سے اس کو دیکھتا رہتا ہے
پر، کچھ کہہ نہیں سکتا

یہ اک لڑکی اسی بوڑھے سے ڈرتی تھی
یہی وہ تھی کہ جس نے عہد رفتہ کے کسی کاغذ پہ
کچھ خوش رنگ تصویریں بنائی تھیں
وہ جن میں عہد نو کی کمفنی کے رنگ تھے
ہر رنگ میں تہذیب کی قبروں سے اٹھتی سسکیاں
قوس قزح سی مسکراہٹ میں بدلتی تھیں
کہ جن میں پھول تھے گمنام سی دنیاؤں کے خوابی جزیروں کے
مگر اس لاابالی، ضدی لڑکی نے (شرارت سے)
بس اک پاؤں کی ٹھوکر مار کر ایزل پٹخ ڈالا
تو پھر بھی 5×4 فٹ کے چوکھٹے میں دبکا بوڑھا
اس سے کچھ کہہ ہی نہیں سکتا
سو اب کیا کیجئے
کہ بیکراں تاریخ اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کی کوئی عادت نہیں رکھتی
سنا ہے ماسکو کہ جس کی گلیوں میں پرومیتھس کوئی ستر برس ٹھہرا رہا
اب اس کے جانے سے بہت ہی سرد طوفانوں کی زد میں ہے
نئے کیلنڈروں پر اب دسمبر کے علاوہ کچھ نہیں ہے؟

سوچوں کے ہینگر پہ ٹنگی آنکھیں

انامیکا!

ذرا دیکھو

کہ سورج کتنے جنموں سے مری گلیوں میں ٹھہرا ہے
مگر ایسی سیاہی تو کبھی دیکھی نہیں ہو گی

سیہ سورج، سیہ گندم، سیہ آنسو، سیہ پرچم
سیہ اوراق بھی تم نے کبھی دیکھے نہیں ہوں گے

انامیکا! جنم بھومی ہے یہ میری

جہاں تیتی صلیب شہر کا ہمزاد ہو بیٹھا

پھر اس کے بعد سے جو دن چڑھا

وہ اب پہ گالی، ہاتھ میں پستول لے کر سر پہ آ بیٹھا

یہاں جب رات بھی آئی

تو سر میں مقتلوں کی راکھ آنکھوں میں لہو لائی

مرا ٹیچر تو کہتا تھا

''محبت مر نہیں سکتی..........................

شعور و آگہی بھی بک نہیں سکتے...................''

یہ میرے شہر میں ہمدم!

شعور و آگہی حرص و ہوس کا رزق بنتے ہیں

(وہ شاید سچ ہی کہتا تھا

کہ وہ اس وقت ٹیچر تھا

میں اک معصوم سا بچہ)

مگر جب مکتبوں سے ڈگریاں لے کر میں لوٹا تھا

اسی دن سے

مرا یہ شہر تو اندھے سرابوں کے کسی لامنتہا جنگل میں رہتا ہے

اور اب تو اپنے ماضی کے ہزاروں بت تراشے
مسجدوں میں گونجنے والی اذانوں پر وہ اٹھتا اور سوتا ہے

شکستہ یاد کی سیڑھی پہ بیٹھا
ہاتھ میں تسبیح کے دانوں کو گھماتا اور کہتا ہے
کہ اب لوحِ مقدر پر لکھا مٹ ہی نہیں سکتا!!

انامیکا!
مری سوچوں کے ہینگر پر ٹنگی آنکھیں یہ کہتی ہے
"ستارے کیوں نہیں چمکے؟
سویرے کیوں نہیں مہکے؟
چوراہے میں کھڑے برگد کی آنکھیں کیوں نہیں برسیں؟
زبانوں پر لگے چپ کہ یہ تالے کیوں نہیں ٹوٹے؟
خیالوں میں تنے مکڑی کے جالے کیوں نہیں اترے؟"

انامیکا!
تمھیں شب کے کناروں پر نیا سورج بنانا ہے
تمھیں اندھے نگر کے ہاتھ پر آنکھیں بنانی ہیں
صداقت امر کرنی ہے!

483واں دن ــــــ یاد کا

اک چہرہ تھا

دو آنکھیں تھیں

جو بستی بستی پیچھا کرتی رہتی تھی

اور قربت کا اک ساگر تھا

جو سو جنموں کا پیاسا تھا

کچھ سپنوں کی تعبیریں تھیں

جو جیون کے اک موڑ پہ مجھ کو ملنی تھیں

پر ملی نہیں

کچھ وعدے تھے

جو سانسوں کی اک نہج پہ پورے ہونے تھے

پر ہوئے نہیں

جو چہرہ تھا

وہ تنہائی کے صحراؤں میں ڈوب گیا

جو آنکھیں تھیں

وہ دکھ کی گہری جھیل میں اتریں

ڈوب گئیں

اے یاد! ٹھہر

کچھ اور بتا

اے درد! مجھے کوئی بھولا بسرا گیت سنا

یہ آنکھیں گیلی رہنے دے

بن موسم کا یہ ساون کچھ دن اور مرے ہاں رہنے دے

دستاویز

حیات قرنوں کی اک شرارت

ازل سوالوں کا اک کھنڈر ہے

یہ بھید مایا کا کون کھولے؟

یہ بوڑھے بھکشو کو کیا پتہ ہے

کہ قصر مایا کا آہنی در شکستہ مندر کی چابیوں

سے کھلا ہی کب ہے؟

فلک سے زہراب جب بھی برسے

تو کھیت اجڑے، بگولے اٹھے

اور آندھیوں نے 'مہا بھارت' بھی روند ڈالی

(ابد کے چرخے کی کوک ٹھہری نہ دیوتا پتھروں سے نکلے)

یہ بات بھکشو نہ جان پایا

برہمنوں کی حویلیوں میں سویر کیوں ہے؟

(اداس داسی کا رقص ٹھہرے تو دیوتاؤں سے کوئی کہہ دے

کہ پاک ویدوں کے لفظ سارے ہی خون آلود ہو چکے ہیں

بلند محلوں کی سیڑھیاں بھی لہو سے تر ہیں)

یہ وقت دیوی کے رتھ کا چکر کہ جس کی زد میں ہزار صدیاں

مگر وہ انساں!

اسیر انتھک مسافتوں کے!!

پھسلتی ڈھلوان کے مسافر!!!

کہ جن کے کاندھوں نے وقت کی سل اٹھا رکھی ہے

وہ بھید مایا کا جانتے ہیں

وہ جانتے ہیں

کہ ہاتھ کن کے خموش پتھر کی مورتی کو تراشتے ہیں

ٹشو پیپر پہ لکھا سچ

عمر گزری وقت کے حیرت کدوں میں گھومتے
ایڑیوں کی تھاپ پر اک ان سنے سے گیت کو
سیٹی کی لے میں ڈھالتے
ناخنوں سے میز پر ڈھولک بجاتے، ناچتے
اور زندگی کی مورتیں تبدیل ہوتے دیکھتے
ہم نے تو پوچھا تک نہیں
"اے نامکمل عہد کے پورے خدا!

جو ماؤں نے بچے جنے تھے

وہ ادھورے کیوں رہے؟

اور آگہی صحراؤں میں اتری

تو پیاسی ریت کے ہونٹوں پہ نوحہ کیوں بنی؟

جو روشنی سوکھے ہوئے دریاؤں میں اتری

مگر تشنہ لبی قائم رہی

کیوں کر رہی؟''

ہم کیا کہیں؟

اتنے بڑے عالم میں جس سورج سے چاہو کھیل لو

جس آدمی کی بے بسی تم کو پسند آجائے

اس سے کھیل لو

ہم کون ہیں جو معترض ہونے کی جرات کر سکیں

ہم جبر اوڑھے

رات میں کینڈل جلائے

روشنی کے خواب آنکھوں میں لئے بے خود رہے

اور جو کتاب زندگی ردی کے ڈھیروں پر رہی

ہم اس کے ہر اک باب میں ہیرو بنے بیٹھے رہے

جو سر پھرے موسم سیہ عینک لگائے

ہاتھ میں بیئر کی بوتل

جیب میں سگرٹ لئے

گلیوں کی نکڑ پر کھڑے ہو کر ہماری بے بسی

کی سرکسیں تکتے رہے

ہم نے کھڑکی کھول کر ان سے بھی پوچھا تک نہیں

وہ ہماری خلوتوں کو کس کے کہنے پر فنا کرتے رہے؟

ہم چپ رہے ، ہم چپ رہے

بس نیند بن کر رات کی پلکوں پہ بیٹھے

سو گئے

یا گیت بن کر خواب کی بانہوں میں آئے

کھو گئے

ہم کون ہیں؟

ہم کون ہیں؟؟

پھر بھی رادھا خموش بیٹھی ہے

یاد کے دشت جل گئے لیکن آرزوؤں کی آگ بجھ نہ سکی

وقت گھڑیوں سے گر گیا شاید

راستے آنکھ میں اتر آئے

ساری شاموں کو پرس میں رکھ کر ڈوبتی نیند کے خلا میں گم

چاہے جانے کا اضطراب لئے زندگی کس ڈگر پہ لے آئی

کرب کے دائروں کا اک جنگل

دائرے یاد کے کھنڈر سے ہیں

چپ میں لپٹا ہوا سنہری جسم

جس کے وعدوں کی چاندنی کا جل میں نے خوابوں کی اوک میں رکھا

دور تاروں سے دیکھتا ہوگا

وصل کی دوپہر نہیں اتری

کوئی یہ گوپیوں کو بتلائے

مرلیوں کی صدائیں کہتی ہیں خواب کو ہمسفر بنانا تو

درد بھی اپنے دھیان میں رکھنا

تتلیاں خواب زار راتوں میں نیلے پھولوں کو ڈھونڈنے نکلیں

ایک اندھے نگر کے رستے پر

شوق کے امتحان کیسے ہیں؟

سارے پنچھی تھکن سفر لے کر برگدوں کی پناہ میں آئے

بوڑھی آنکھوں سے داستاں چھلکی

داستاں جو طویل تھی اتنی اس کے کردار سو گئے آخر

سبز موسم ادھر نہیں آئے

حسن کھڑکی پہ جم گیا پھر بھی زرد رت کا عذاب باقی ہے

حاصل عمر جتنے سپنے تھے کوڑے دانوں میں جا کے پھینک آئے

خالی جیبوں میں ہاتھ تک بھی نہیں

آرزو، خواہشیں، تمنائیں بے یقینی کی دہشتوں میں تھیں

پھر بھی رادھا خموش بیٹھی ہے

نارسائی کا انت کیا جانے؟

نقطہ ءانجماد سے گرا وقت

مرے اس شہر میں اب بھی
وہی صبحیں وہی شامیں
وہی اخبار کی سرخی
جو صدیوں سے پرانی ہے
مناروں سے تلاوت گونجتی ہے
ہاتھ اٹھتے ہیں
پیمبر چیختے ہیں وعظ کرتے ہیں

مگر لوگوں کے چہروں سے ذرا بھی شب نہیں چھٹتی

مسیحا آج بھی سولی پہ لٹکا ہے

..........................اتر آئے تو دن نکلے

یہاں پر سب دعائیں سرخ فیتوں میں مقید ہیں

پرانی چادروں کی سلوٹوں میں نظم روتی ہے

وہی انتیس ہے ماہ دسمبر کی

(ہمیشہ سے)

یہ اس پت جھڑ کی ازلی خشک سالی میں

مرے بٹوے میں کھوٹی ریزگاری کے سوا کیا ہے!

کبھی اخبار کے اوراق پر ہنستی ہوئی شہوت

جریدوں میں چھپی رنگیں برہنہ لڑکیوں کے لمس

خیالی زیر جاموں کی مہک اور کھولتے جذبے

جنوں میں جاگتی راتیں

نشے میں جھومتے سے دن

تماشے، قہقہے، لذت

کھنکتی بوتلیں، فلمیں

میوزک، ہاؤ ہو، وحشت

''مگر کب تک ....؟

.... یہاں پر تو فقط فیشن بدلتے ہیں''

''...............حرامی، ماں خصم!

............کتے!!

..........................!!!

...............؟''

''ذرا سی واڈ کا ڈالو............''

ابھی وہ دن نہیں آئے

سٹیشن پر سویرے ریل جب سیٹی بجاتی ہے
گئی شب کی مسافت تولیہ کاندھے پر رکھے گنگناتی ہے
''ابھی وہ دن نہیں آئے

کہ جب سورج سنہرا رتھ لئے آنگن میں اترے گا
کہ جب کلیاں بہت ہی شوخ دوشیزہ کی طرح مسکرائیں گی
گلی سے اک نئے موسم کی مہکاریں جب آئیں گی
ابھی وہ دن نہیں آئے''

سمندر اپنے ہونٹوں پر مگر سہمی سی لڑکی کا تبسم اوڑھ کر خود سے یہ کہتا ہے
''کوئی اندھا کنواں ہی ہو

کہ جو بس ایک مٹھی ہی مری تنہائیاں چن لے"

کبھی جب چاند بھی کہسار پر پچھلے پہر آ کر

گھنی نیندوں بھری بوجھل جمائیاں لینے لگتا ہے

تو اک ننھی سی زخمی آرزو رو رو بتاتی ہے

"ابھی وہ دن نہیں آئے..........................."

کبھی تپتی ہوائیں شہر کے باغات میں رک کر پرندوں کو ڈراتی ہیں

تو سہمی تتلیاں سرگوشیوں میں خود سے کہتی ہیں

"ابھی وہ دن نہیں آئے..............................."

ابھی گھڑیال کی سوئیاں چبھی جاتی ہیں چپکے سے

مری حیران آنکھوں میں

ابھی اوہام کی چمگادڑیں ذہنوں سے چمٹی ہیں

ابھی وہ خواب بستی جانے والی ریل گاڑی بھی سٹیشن پر نہیں پہنچی

ابھی وہ دن نہیں آئے

ابھی کچھ دیر باقی ہے

ابھی تو سرخ مسلوں پر بہت سا کام باقی ہے

بے خبری کے پار کا موسم

ارشد!

تم کو یاد تو ہو گا

پچھلے بدھ جو چلتے چلتے

اک آوارہ شام میں ہم نے

بھولی بسری یادوں کی اک موٹی البم کھول کے اس میں

لانبے بال اور سانولے رنگ کی اک لڑکی پر

سیدھے ہاتھ کی انگلی رکھ کر

خوشبو جیسی باتوں کو عنوان کیا تھا

جس کے نرم و نازک گال کے ڈمپل کی تم قسمیں کھایا کرتے تھے

جس کی سانولی رنگت پر میں نظمیں لکھا کرتا تھا

ہم نے اس آوارہ شام میں کتنے گھنٹوں

اس لڑکی کی باتیں کی تھیں

اس کے ہاتھوں، ہونٹوں، آنکھوں، گالوں کی تعریفیں کی تھیں

تم کہتے تھے "وہ ہنستی تو دن بھی چڑھتا جاتا تھا"

میں کہتا تھا "وہ چلتی تو وقت بھی تھم سا جاتا تھا"

تم کہتے تھے "گر وہ مجھ سے سات سمندر پار کسی بے نام جزیرے
پر کھلتے پھولوں کا کہتی،

میں لا دیتا"

میں کہتا تھا "گر وہ مجھ سے دور شفق میں بسنے والی ایک کرن
کی خواہش کرتی،

میں لا دیتا"

تم کہتے تھے "میں تو اس کی ایک تمنا کی خاطر بھی مر سکتا تھا"

میں کہتا تھا "میں تو اپنے لاکھوں جیون اس کے صرف تبسم پر
ہی دے سکتا تھا"

ہم دونوں نے رات گئے تک تاریکی کے کاغذ پر کچھ

ایسے ویسے جانے کتنے دعوے لکھے

اس کی یاد کی اوڑھنی اوڑھے جانے کتنے وعدے لکھے

پیارے ارشد!

کل کالج کے ایک پرانے دوست نے مجھ کو بتلایا ہے

کچھ دن گزرے

سانولے رنگ کی اس لڑکی نے

ایک ذرا سی بات کی ضد میں

آتما ہتیا کر لی ہے

دھندلکا ______ درد کا

اے صنم! آ کہ ہم سوچنا چھوڑ دیں
بات یوں ہے کہ اب زندگی میری گردن دبوچے
مری آگہی کا ثمر مانگتی ہے

یہ کیسے کہوں؟
لے گیا مجھ کو میرا ہی احساس اب
مقتل کرب میں
غم کے پاتال میں
روشنی، خواب، امید کے جتنے بھی تھے کنول

جو مری سوچ کے پانیوں پہ اگے

سارے مرجھا گئے

اور اگلے ہی پل کانچ کی بوتلوں میں پڑی آگہی

ایک جھونکے کی آہٹ سے چھن سے گری

پاؤں زخمی ہوئے

مر گیا ہر یقیں

کھو گیا ہر گماں

خوف ملبوس ہے

بے بسی پیرہن

راستے مٹ گئے

بھید کھلتا نہیں

درد رکتا نہیں

نیند کی گولیاں، چرس، کوکین اور مے مقدس ہوئی

جن سے ملتی ہے تھوڑی سی چوری شدہ بے خودی

پھر وہی سسکیاں، درد، کرب والم

اے خدائے اجل!

(تو اگر ہے تو سن.................!)

کیوں عدم کی فصیلوں سے مجھ کو گرایا گیا

زندگی کے گھنے بے اماں دشت میں

جو زمانہ ملا وہ بھی میرا نہیں

جو زمیں میرے حصے کی مجھ کو ملی

وہ مری آگہی کے لئے ایک پاتال ہے

میں ادھورے زماں کا دریدہ بدن

جس کے سجدوں کی تاثیر گم ہو گئی

بے یقینی کی دہشت سے ڈرتا رہا

کتنا انمول تھا، پھر بھی بکتا رہا

اپنے ہونے پہ افسوس کرتا رہا

پھر بھی ملزم رہا؟''

بند کواڑوں پہ اگی آنکھیں

مال روڈ کے پچھواڑے سبزی منڈی کے پاس
ڈھائی مربع میٹر کا اک نیم تاریک سا کمرہ
جس کی چھت سے جھولتا چالیس واٹ کا اک بیمار سا بلب
اک دیوار کی شیلف میں سوئی گرد آلود کتابیں
اور مکڑی کے جالے
اور دوجی کے بیچ ٹنگی اک بوڑھے کی تصویر
(ڈھائی مربع فٹ کے ایک فریم کی جیل کا قیدی)

دائیں کے اوپر کچھ لفظوں کی کہنہ سی تحریر

(خواب نگر کو جانے والی چٹھی کا سرنامہ)

بائیں سے چمٹا گز بھر کپڑے کا اک گہرا سرخ پھریرا

اور گذشتہ کچھ سالوں سے بند پڑی وہ کھڑکی

جس نے روک رکھا ہے باہر بازاروں کا شور

میل بھری اک میز کہ جس پر بوسیدہ سے کاغذ

کچھ تخمینے، نام، پتے اور عام حساب کتاب

ایک کڑک چائے کی پیالی اور تازہ اخبار

اس کے پیچھے کرسی پر اک سوچ میں گم سم شخص

نیم کھلے در میں وہ کوئی نصف صدی سے آنکھیں رکھے

جانے کس کو دیکھے؟

عکس کی قید

وہ بھی کیسی لڑکی تھی
پانیوں میں بہتی تھی
بادلوں میں رہتی تھی
سانس سانس چلتی تھی
بات بات رہتی تھی
ہونٹ میں ہلاتا تھا اور وہ مہکتا سا
گیت بنتی جاتی تھی

جو قلم ہلاتا تو دل کے صاف کاغذ پر

نظم بنتی جاتی تھی

آنکھ کے دریچے میں چاند بن کے کھلتی تھی

اور میرے خوابوں کی وادیوں میں رہتی تھی

وہ بھی کیسی لڑکی تھی

اپنی موت سے پہلے دوسرے دن آنے کا

وعدہ کر گئی تھی وہ

دوسرا برس لیکن بیتنے کو آیا ہے

پھر بھی وہ نہیں آئی

کیا عجیب لڑکی تھی

آج وہ فنا اوڑھے خاک کے گھروندے میں

گہری نیند سوتی ہے

ہنستی ہے نہ روتی ہے

(بے وفا نہیں لیکن بے وفا سی لگتی ہے)

چند روز رک جاتی
اشک بن کے آنکھوں کے پانیوں میں کیوں بہتی
دھند بن کے خوابوں کے بادلوں میں کیوں رہتی

(جاوید انور کی نذر)

افلاک گونگے ہیں

یہ خواہش کب ہماری تھی..................!
کہ ہم افلاک کے فرمان کی سولی پہ جالٹکیں
دکھی جیون کی اندھی گھاٹیاں اتریں
پھران بیکار سانسوں کی اسیری کا کفن اوڑھیں
یا اک دن بس یونہی بیٹھے بٹھائے
موت کی انگلی پکڑ کر مرقدوں اندر اتر جائیں
مگران ساری باتوں کی وضاحت سے بہت پہلے

نیا دن دوڑتے اور ہانپتے سورج پہ بیٹھا
ادھ کھلی کھڑکی کے رستے

خواب زاروں میں اترتا ہے

ہم اپنے ٹُتھ برش منہ میں لئے

اور تولیے کو ہاتھ میں تھامے

پھر اس جبر مسلسل کے لئے تیار ہوتے ہیں
گھڑی کی تال پر رقصاں
بے حس کیلنڈروں کے صفحے گنتے ہیں

گٹر کے ایک انقلابی کیڑے کا ترانہ

نعرے ردی میں پھینکے ہوئے چند کنڈوم ہیں
یا کوئی حکمرانوں کی جوئے میں ہاری ہوئی داشتاؤں کے
چھوڑے ہوئے زیر جاموں کا اک ڈھیر ہے
یہ نظام کہن چوک میں بک رہی اک طوائف تو ہے
جس کا بھاؤ چکانے کو کتنے وڈیروں کی بازار میں بھیڑ ہے
اس کی جمہوریت ایک اترن ہے یورپ کی بھیجی ہوئی
پوری آتی نہیں جسم بے جان پر

اور اس کی حفاظت پہ بیٹھا ہوا ایک جرنیل ہے
(جس کے خستہ مثانوں کے اندر بھی بارود ہے)
ریڈیو اور ٹی وی دو کتے ہیں
جو بھونکتے ہیں مگر ان کی زنجیر کھلتی نہیں
''دین خطرے میں ہے............''
''دیس خطرے میں ہے............''
ٹیپ کے دونوں اطراف میں ایک ہی گیت ہے
بوڑھا بابا جو دو وقت کی روٹیوں کے لئے
عمر ساری کسی بیل کی طرح سے گھومتا ہی رہا
اس کو کیا تھا پتہ؟
پھول کلیاں بھی
خوشبو بھی جیون کے رستے کا اک موڑ ہیں
وہ تو جرنیل کے اردلی کی طرح
خود میں ہی گم رہا
سر جھکائے ہوئے ہر قدم چپ رہا

کائنات سے باہر گری وقت کی کترن

امر لمحہ

کہ جیسے ہو کسی ویرانے میں اک اونگھتا معبد

(ہزاروں سال پہلے مضطرب گوتم کے من میں آن ٹھہرا تھا)

گزشتہ کل صحن کی ادھ گری دیوار کے نزدیک

جس پر جنگلی بیلیں دسمبر کی سنہری دھوپ

میں مدہوش لیٹی ہیں

مرے اندر اتر آیا تھا دھیرے سے

یہ ساری کائناتیں جم گئی تھیں

کہ جیسے ہوا زل کے بیکراں ساگر میں ٹھہری شانتی کا نم

ہوا، خوشبو، خموشی اور رنگ سارے زمیں کے اولیں باسی

مجھے پہلی دفعہ ملنے کو آئے تھے

یہ شاید وقت اس لمحے ہی جنمّا تھا

کہ جس کی دوڑ سے نا آشنا

ماچس کی ننھی تیلیوں کے کھیل میں گم سم انا میکا

اسی ازلی امر لمحے میں جیتی ہے

سو اس کے سامنے مغرور سا یہ وقت پیچ و تاب کھاتا یوں کھڑا ہے

جیسے بے بس ہے

انا میکا!

بچارے وقت کو بس دوڑنے اور ہانپنے

یا بیت جانے کے سوا آتا ہی کیا کچھ ہے؟

وعدوں کی اجرک

مجھے تم رفاقت کے پل کا کوئی تحفہ بھیجو

سنہرے دوپٹے کے پلو سے باندھا وہی ایک وعدہ ہی بھیجو

میں ان سے محبت کی رعنائی لے کر

کٹھن زندگی کے اندھیرے سفر پر چلوں گا

کہ تیرے لئے روشنی، چاند، تارے، ہوا، خوشبوئیں

اور نغموں سے مہکا ہوا اک جہاں لے کے آؤں

جو اپنے حسیں خواب سا اک جہاں ہو

سوتم بھی وہ کمرے میں بیٹھی ہوئی

اندھی چڑیا کی آنکھوں میں اتری ہوئی سوئیاں چنتی رہنا

کہ اس ننھی چڑیا کی آنکھیں

مرے اور تیرے ملن کے حسیں موسموں کی

شروعات کا استعارہ بنیں گی

اختتام کے بعد کی کہانی

بہت سال بیتے
وہ ماہ مقدس کی اک رات تھی جب...............!
کسی بوڑھے انگریز نے لوٹ جانے سے پہلے وطن
برتھ ڈے کیک کی طرح سے کاٹ ڈالا
جسے اس کے اپنے سدھائے ہوئے بھیڑیئے کھا گئے تھے
مرا بوڑھا دادا تماشائیوں میں کھڑا تالیاں پیٹتا رہ گیا
کیسا انجان تھا

میرا والد بھی تھا ایک خواب گریزاں کے نشے میں بہکا ہوا

وہ بھی رعشہ زدہ ہاتھ سے جیپ میں لپٹی ہوئی

تالیاں پیٹتا چل بسا

پر مجھے اس پرانے ڈرامے سے کوئی سروکار کیا؟

مجھ کو اس کا کوئی گیت

یا کوئی بھی سین تک یاد آتا نہیں ہے

کہ جب میری آنکھیں کھلی تھیں

تو لوگوں کے بازو ہی نہ تھے

بس آنکھیں بچی تھیں

جو بے خواب سی تھیں

اجل! یاد رکھنا

اجل! یاد کر وہ ازل روز میں نے

جو حیران و ویران مٹی پہ پاؤں رکھا تھا

تو بے جان سی ہو کہ تو رہ گئی تھی

سمٹ کر یہ عالم مرے ہاتھ کی ایک مٹھی میں اترا

اجل! تو نے دیکھا

زمانے مرے ابروؤں کی فقط ایک جنبش پہ مارے گئے

اور کتنے ہی ادوار تھے جو کہ مسلے گئے ہیں

اجل! میں ہوں انساں

سو میرے ادب میں زمان و مکاں بھی جھکے جا رہے ہیں
میں سیل رواں ہوں
کہ میرے ارادوں سے مرعوب ہو کر
خلا در خلا دوڑتی کہکشائیں پریشان سی ہیں
ہوا، روشنی اور آواز کے دیوتا میری دہشت سے گنگ ہیں
وہ پتھر کے تاریک غاروں سے لے کر
یہ بجلی سے روشن چمکتی شبوں تک
خراماں خراماں چرندوں کی چبھتی کمر سے
زمیں آسماں میں گرجتے شہابات ثاقب سے بھی تیز رفتار انجن
وہ لکڑی کے بھدے سے پہیے سے لے کر
خلا میں پھسلتے ہوئے راکٹوں تک
یہ سب کچھ جو ہے میرا رخت سفر ہے
یہ میرے سفر کی شروعات ہیں سب
اجل! یاد رکھنا
کبھی بھی غلط فہمیوں میں نہ رہنا

روش ندیم سے سر راہ ملاقات

جین کی وہی جیکٹ
اک وہی پھٹی سی پینٹ
ناک پر وہی چشمہ
ہونٹ میں وہی سگرٹ
گرد سے اٹے گیسو
سوچتا ہوا چہرہ
کچھ بھی تو نہیں بدلا
جیب میں وہی نظمیں کاغذوں کے ٹکڑوں پر

ٹیلی فون کے نمبرز سگرٹوں کے پنوں پر

انقلاب کے نعرے چائے کی پیالی پر

آج بھی وہی باتیں سانولی سی لڑکی کی

آج بھی وہی قصہ دکھ بھری جوانی کا

وقت کی روانی کا

اپنی نارسائی کا

اس کی بے وفائی کا

کچھ بھی تو نہیں بدلا"

وہ جو گھر سے نکلا تھا یہ جہاں بدلنے کو

تھک کے ہار بیٹھا ہے

سب سے آج کہتا ہے

''زندگی ہی ایسی ہے زندگی سے شکوہ کیا''

آکاش بن کا تارا

سر کیے وحشتوں کے پہاڑ

ڈوبے بیٹھے رہے

تیری یادوں کی گہرائی میں

صدیوں چلتے رہے

پابرہنہ ترے غم کے صحراؤں میں

آنکھ خاموش تھی، ہونٹ حیران تھے

تیری بانہوں کے آنگن بہت دور تھے

کتنے جیون بتے، کتنے ساون رسے

کتنے چہرے ملے

جن کے گالوں پہ ہم نے تری چاہ میں

دکھ بھرے گیت ہونٹوں سے کندہ کیۓ

کتنے کندھے ملے

جن پہ سر رکھ کے پہروں تری راہ میں

ہم نے انجان آنکھوں سے وعدے کیۓ

کتنے معصوم تھے

بے خیالی میں جو چند گھڑیاں ہمارا سہارا بنے

اور سمجھا کیۓ ہم انہی کے تو ہیں

پر انہیں کیا خبر؟

ہم ادھورے بدن ان کے کچھ بھی نہیں

ان سے کیسے کہیں

ہم ہیں راہی کسی اور ہی راہ کے

ہم ہیں پنچھی کسی اور ہی دشت کے

ہم یہ آنکھیں یہ کندھے یہیں چھوڑ کر

ایک دن خامشی سے چلے جائیں گے

'نیو کربلا ٹاؤن' کا لوک گیت

ہمارے جسم کی ویراں گلی میں بھی اندھیرے جاگتے ہیں
نیند ہے کہ بھول کر بھی اس طرف کا رخ نہیں کرتی
ہم اپنی بیویوں کے جسم بھی چھونے سے ڈرتے ہیں
کہیں ایسا نہ ہو جائے
کہ بستر کی کہانی دن کو بتلائیں
تو اس پر ٹیکس لگ جائے
ہمارے ذہن بد بودار کوڑے داں بنا ڈالے
ہماری ماؤں کے رحموں میں بھی تیزاب بھر ڈالا

ہم اپنے ہی حسیں چشموں کا پانی پی نہیں سکتے
ہم اپنے ہی علاقے کی ہوا بھی مول لیتے ہیں
وہی بوڑھا کہ جس نے ہجرتوں میں
اپنا اک بازو اور اک بیٹا گنوایا تھا
یہ کہتا تھا
''خدا میرا کہ جس کے آستاں پر
کہف کے اصحاب کا کتا بھی بخشا جا چکا ہے
وہ یہ سب کچھ ٹھیک کر دے گا''
مگر بوڑھا یہ کیا جانے؟
غریبوں کا خدا بھی تو ہمیشہ سے بڑا مصروف رہتا ہے
فقط اپنے ہی دھندوں میں

چلو یادیں بناتے ہیں

چلو اب وقت کی رتھ میں بٹھا کر اپنی سانسوں کو
ہم اس جیون کے گھوڑے کو لگا کر زور سے چابک
ہوا میں چھوڑ دیتے ہیں

چلو یادیں بناتے ہیں
چلو خاموش رہتے ہیں
چلو ہم آج سب باتیں فقط آنکھوں سے کہتے ہیں

یونہی ناراض سے ہو کر کبھی ہم تم منانے کی

کوئی شرطیں لگاتے ہیں

کسی معصوم لڑکی سے کوئی وعدہ محبت کر کے

نبھانا بھول جاتے ہیں

یا اس کے نام کو لکھ کر کسی برگد کی ٹہنی پر

مٹانا بھول جاتے ہیں

کسی چڑیا کے بچے کو اسی کے گھونسلے سے ہم

اٹھا کر چھوڑ دیتے ہیں

کسی ننھی سی تتلی کو کسی کاغذ کی کشتی میں

بٹھا کر چھوڑ دیتے ہیں

کسی بچے کے گالوں پر کوئی تنکا چبھو کر ہم

رلا کر چھوڑ دیتے ہیں

کبھی فٹ پاتھ پر رک کر کسی بوڑھے مسافر کو

ہنسا کر چھوڑ دیتے ہیں

کبھی سردی کی شاموں میں اکیلے گھومتے پھرتے
کسی کو یاد کرتے ہیں
کبھی بارش کے موسم میں کسی لمبی سڑک پر ہم
یونہی چلتے نہاتے ہیں

مگر جیون کے البم میں کچھ ایسی بھی تو یادیں ہوں
کہ جن کی عمریں لمبی ہوں
تو پھر ہم ایسا کرتے ہیں تعلق جو رہا برسوں
ہم اس کو توڑ دیتے ہیں
اسی جیون کٹورے کو کسی اونچی عمارت سے
اٹھا کر چھوڑ دیتے ہیں

چلو یادیں بناتے ہیں

دیار خواب میں ایک دن

ہو سکتا ہے دن نکلے تو

اس کے ہاتھ میں آنے والے اس موسم کی چٹھی ہو

جس موسم کی ایک کہانی

بیتی رت میں اک آوارہ بادل کہتا رہتا تھا

ہو سکتا ہے وہ اک چٹھی

دور نگر میں رہنے والی اس لڑکی نے بھیجی ہو

جس کی چاہ میں اپنی جانے کتنی صبحیں شام ہوئیں

جس کی خاطر اکلاپوں کے جگراتوں کا درد سہا

جس کی رہ میں دروازوں میں آنکھیں رکھ کر بھول گئے

ہو سکتا ہے اس لڑکی کے خوابوں میں ہم آئے ہوں

ان خوابوں میں ہاتھ ہمارا تھام کے اس نے

شاید ایسی بات کہی ہو

"آج کے بعد مرا جیون بھی

تیری ذات سے وابستہ ہے"

لیکن یہ ممکن کیسے ہے؟

ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟

امیدوں کے گڈی کاغذ

کتنی بارش سہہ سکتے ہیں؟

موسم، بادل، خواب اور لڑکی

ایک ہی شام کی تصویریں ہیں

شام کسی کی کب ہوتی ہے؟

باب ازل کا اگلا ورق

اس نے جس دن

اپنی پچھلی ٹانگوں پر چلنا سیکھا تو..................!

اونچے پیڑوں کی شاخوں سے نیچے اترا

فر کا کوٹ اتار کے زور سے پٹخا

آسمان کو گھور کے دیکھا

''کن'' کہا

اور چیخ مار کر ماتھے کو مٹی پر رکھا

تب سے وہ سارے عالم کو

ٹانگوں کی محراب کے نیچے سے تکتا ہے

اخبار میں لپٹی نظم

ایک ٹرک جو بے قابو تھا

آج سویرے اک اخبار کے کالم میں سے

نکل کے مجھ کو ناشتے والی میز پہ بیٹھے

روندتا آگے نکل گیا تھا

ابھی میں اس سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا

کہ پہلے ورق کی شہ سرخی سے دہشت گرد نے

دستی بم کو میری جانب پھینک دیا تھا

اس سے بچنے کی کوشش میں چائے کی پیالی
میرے ہاتھ سے پھسل کے میرے
کپڑوں پر ہی الٹ گئی تھی
مجھ پہ قیامت بیت رہی تھی
لیکن میرا ننھا بچہ مجھ پر ہنستے
تازہ چائے کی چسکی لیتے
میری جانب دیکھ رہا تھا

زندگی سے مصافحہ

زندگی کو دیکھا ہے..............؟

زندگی وہ چڑیا ہے جو ٹھٹھرتی راتوں کو بارشوں میں اڑتی ہے
زندگی کہانی ہے جو ہر ایک بچے نے موت کو سنانی ہے
زندگی وہ دیوی ہے جس کے پاک چرنوں میں خون کے پیالے ہیں
خون کے پیالوں میں موت کی کہانی ہے
موت کی کہانی میں ایک ننھا بچہ ہے
جو کہ سرد راتوں کی بارشوں میں مرتا ہے

موت ایسا دکھڑا ہے کوکھ سے جنم لے کر جو مدارِ ہستی میں
ساتھ ساتھ چلتا ہے

زندگی پہ سوچا ہے......................!

پکار

(وسیم اور نعیم کے لئے)

چھوٹے بھائیو!

سات سمندر پار بسی دنیا کی چاہت دل میں لے کر
تم جو ہم سے سال و سال کی دوری پر ہو
تم کو ایسی جلدی کیا تھی؟
وہ اک دنیا جو ہم تم نے
ماں اور باپ کی انگلی تھامے قائم کی تھی
جس کے اندر وعدوں کی کچھ جھیلیں تھیں

اور خوابوں کے خوش رنگ جزیرے

چاہت کی کچھ گلیاں تھیں

اور مسکانوں کے چوراہے تھے

اس دنیا میں رہ تو لیتے

قربت کی اس ندیا میں کچھ بہہ تو لیتے

چھوٹے بھائیو!!

آجاؤ نا! کتنی آنکھیں بس اک دید کو ترس گئی ہیں

آجاؤ نا! اس سے پہلے وقت و مکاں کی دوری اک دن

سارا کچھ ہی چھین لے ہم سے

TISSUE PAPER PE LIKHI NAZMEIN

TISSUE PAPER PE LIKHI NAZMEIN

PRESENTATION OF MODERN POEMS
A CREATIVE VOICE OF TODAY

BY

RAVISH NADIM